مولانا سعید احمد اکبر آبادی

معجزبیان[۱]، سحراللسان

ابھی مولوی عبدالحق کو دنیا سے سدھارے پورا ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ملتان میں وفات پا جانے کی خبر ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

شاہ جی کی ابتدائی تعلیم و تربیت پٹنہ میں ہوئی جو دلی اور لکھنو کے بعد اردو زبان اور شعر و شاعری کا تیسرا مرکز تھا اور اسی کا اثر تھا کہ شاہ جی نسلاً پنجابی ہونے کے باوجود اردو زبان ٹکسالی بولتے اور اس کے محاورات و ضرب الامثال پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔

۔ نانی سے اردو بول چال کی زبان سیکھی۔ شاد عظیم آبادی کے اس خاندان سے ذاتی مراسم تھے۔ اس تقریب سے شاہ جی کو بھی شاد عظیم آبادی کی صحبتوں میں بیٹھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ ذہانت و فطانت خداداد تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کم عمری میں ہی پختہ ہو گئے، دماغ چمک اٹھا اور زبان منجھ گئی، پھر پٹنہ سے نکل کر مختلف علماء سے وقتاً فوقتاً تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس لیتے رہے۔ لیکن وہ بھی بے ضابطہ اور بے قاعدہ[۱]۔

شاہ جی یوں تو علم و فضل اور سیرت و اخلاص کی بہت سی خوبیوں اور کمالات کے جامع تھے جن کی وجہ سے لوگ ان کی دل سے قدر اور عزت کرتے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا کمال جس میں کوئی ان کا ہم عصر ان کا شریک نہیں ہو سکتا تھا وہ ان کا کمال خطابت و تقریر تھا۔ گھنٹوں یکساں روانی جوش اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ بولتے تھے اور کیا مجال کہ ایک شخص بھی اکتا کر مجلس سے اٹھ جائے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ تقریر نہیں کر رہے ہیں نشہ پلا رہے ہیں۔ سامعین تو سامعین فضا تک پر معلوم ہوتا ہے سکر کا عالم طاری ہو گیا ہے۔ بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کی تقریر سنتا تھا اور جھومتا تھا۔ ان کے پاس اعجاز بیان اور سحر خطابت کا ایسا کارگر حربہ تھا کہ اگر وہ چاہتے تو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لئے اس سے زیادہ کام لے سکتے تھے لیکن ان کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ تحریک خلافت، مجلسِ احرار اسلام اور ہر میدان میں صرف ایک سپاہی بنے رہے۔ دوسروں کے تابع رہ کر کام کیا لیکن کبھی خود قائد نہیں بنے۔ ہمارے نزدیک دینی اعتبار سے شاہ جی کے لئے اس سے بڑا کوئی دوسرا شرف اور مقام نہیں ہو سکتا تھا کہ جب انہیں امیر شریعت منتخب کیا گیا تو سب سے پہلے حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے جو اس زمانہ میں علم و فضل میں اللہ کے حجت تھے۔ شاہ جی کے ہاتھ پر بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ بیعت کی۔ یہ صرف دنیا کا ہی سب سے بڑا اعزاز نہ تھا بلکہ یہ بیعتِ انوری اس کی بھی ضمانت تھی کہ اللہ کے یہاں اس کا حسن عمل اور دینی ولولہ و جوش مقبول ہو چکا۔ اور آج وہ دنیا میں نہیں ہیں تو امید قوی ہے۔ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کی دعوت قدس کے خلعت فاخرہ سے سرفراز و شادکام ہو رہے ہوں گے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ

(ماخوذ، نظرات: "برہان" دہلی ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۳۱، ۱۳۲)

۱۔ شاہ جی دورانِ تعلیم ہی قید و بند کی صعوبتوں سے آشنا ہو گئے اس لئے سلسلہ تعلیم میں تسلسل قائم نہ رہ سکا، مگر اس کے باوجود آپ نے دورۂ حدیث تک تعلیم مکمل کر لی۔ (ادارہ)

پروفیسر تاثیر وجدان

امیرِ شریعتؒ

زندگی کی ایک موجِ تُند جولاں

زیر نظر مقالہ محترم پروفیسر تاثیر وجدان صاحب نے ر ستمبر ۱۹۹۱ میں حضرت امیرِ شریعتؒ کی یاد میں دارِ بنی ہاشم ملتان میں منعقدہ تقریب میں پڑھ کر سنایا۔ (ادارہ)

اہلِ خیر کی اس مجلسِ ذکر و فکر میں میری شرکت تو صرف حصولِ اجر و ثواب کی نیت سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے انسان کی عظمت کے اعتراف کے لئے خود معترف میں کسی نہ کسی درجے کی عظمت کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو مجھ میں نہیں۔ مجھ ناچیز کا مقصد و مدعا شاہ جی مرحوم کی زندگی کے سوانح کی گہری تحقیق نہیں، نہ ہی ان کے شخصی اور نجی حالات و واقعات کی پوری پوری تدوین میرا مقصود ہے اور نہ ہی ان کے مجاہدانہ، خطیبانہ اور مصلحانہ اور عارفانہ مقام و مرتبہ کے بارے میں کوئی باقاعدہ اور جامع مقالہ پیش کرنا میرا ہدف کہ مجھ میں اس کی اہلیت ہی نہیں۔ ان چند سطور کا منشا تو صرف ۱۸۹۱ء اور ۱۹۶۱ کے درمیان کی عظیم ۷۲ سالہ زندگی کے سامنے جو پٹنہ سے چلی اور خاکِ ملتان میں ہمیشہ کے لیئے روپوش ہوگئی سر جھکا کر صرف اظہارِ عقیدت کرنا ہے۔

عقیدتوں کی زبان جذباتی اور تاثراتی ہوجایا کرتی ہے۔ اس لئے میں معذرت خواہ ہوں کہ میری اس جذباتی ژولیدہ بیانی کا خطاب بھی آپ کی تجزیاتی اور استدلالی عقل سے نہیں بلکہ براہِ راست آپ کے دل سے ہے۔ کیونکہ یہ طے ہے کہ جس محفل سے میں مخاطب ہوں وہ بنیادی طور پر اہلِ دل ہی کی محفل ہے

خُدائے بزرگ و برتر کے جوشِ رحمت نے اس بسیط و بیکراں کائنات کو پیدا کیا، اور اس کے استمرارِ رحمت نے اس ارضی کائنات میں اولادِ آدم کی دائمی و روحانی کفالت اور خبر گیری کے لئے مسلسل انبیائے کرام بھیجے۔ پہلی بات کو قرآن نے رحمانیت کہا اور دوسری کو رحیمیت۔ نبوت مرحلہ در مرحلہ اپنے ارتقاء کے فطری مقسوم کو پورا کرتی ہوئی جب اپنے آخری نقطۂ کمال کو پہنچی تو وہ نبوت آخر الزّمان کے نام سے موسوم ہو کر حیات و کائنات کے دائرے میں آخری اور ابدی رحمتوں کے گراں قدر آبِ حیات سے تمام معلوم اور نامعلوم دنیاؤں کو ان کی آخری سرحدوں تک سیراب کر گئی۔

اے ترا قدسی ظہور انعامِ ربِّ کائنات!
کون جانے تیری رحمت کی پناہ گاہی کی حد
تیری رحمت کی ہمہ گیری کا سچا سائباں
دکھ سے پتھرائے ہوئے چہروں کا دمساز و انیس

اے پیمبرِ خلد کا ابرِ کرم تیرا وجود۔
کیا خبر کن کن جہانوں پر ہے کب سے سایہ گستر
دھوپ میں جلتے سروں کا آخری ملجا و ماویٰ
غم شناس و مہرباں آغوشِ مادر کی طرح

اس انتہائی برتر اور انتہائی برگزیدہ نبوّۃ نے ساری مخلوق میں نوعِ انسانی کی عزت بڑھا دی۔ اب ربِّ کریم نے ہمیں پھر اپنے کرم سے نوازا، اور نبوّتِ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوڑے ہوئے گراں قدر روحانی ورثے کے محافظ اور اس کے اسوۂ حسنہ کی عظیم روایات کے وارث اور امین بھی پیدا کر دیئے۔ جنہوں نے انسانی روح کے لہلہاتے چمن زاروں کو تندئی بادِ صرصر سے بچایا۔ ان وارثانِ نبوت میں مفسرین، محدثین، مجتہدین مجاہدین، علماء، فقہاء، صلحاء، اتقیاء، اولیاء، حفاظِ قرآن اور قاریانِ کرام وغیرہم شامل رہے۔ غرضیکہ عظیم، مقدس اور نہایت ہی قیمتی ہستیوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا دریا تھا، جو اسلامی تاریخ کا ایک بھرپور اور جیتا جاگتا تسلسل بن کر کرۂ ارض کی زندگی کو اپنے فیض سے سیراب کرتا رہا۔ انسانی روحوں کی آبیاری کرنے والے اسی دجلۂ خیر و برکت کی ایک موجِ تند جولاں کا نام تاریخ نے عطاء اللہ شاہ بخاری رکھا، جس نے بڑے بڑے نہنگوں کے نشیمنوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

یہ کیسی زندگی تھی جو واقعۃً سرزمینِ ہند پر ایک موجِ تند جولاں بن کر ابھری اور پھر اپنے ساتھ متوازی چلنے والے پورے سیاسی، سماجی اور مذہبی عہد کو ایک نہایت فعّال عنصر بن کر دور دور تک متأثر کر گئی۔

اس کی باغیانہ غیرت، اس کی سرفروشانہ جرأت، اس کی قلندرانہ اداؤں اور اس کے سکندرانہ جلال نے اپنے دور کے مستبد اور ظالم یورپی حکمرانوں اور ان کی کاسہ لیس نوکرشاہی کی راتوں کی نیند حرام کر دی، اس نے ناموسِ رسالت کے ڈاکوؤں کا عمر بھر پیچھا کیا، یہ کیسی زندگی تھی جو ٹوٹ جانا اور بکھر جانا جانتی ہی نہ تھی، وہ نہ نکبت و ہزیمت سے واقف تھی اور نہ ہی دشمن کے ساتھ کسی مفاہمت یا سمجھوتے کا اس کے ہاں کوئی تصور تھا۔ یہ کیسی زندگی تھی جس نے حق کی نمائندہ بن کر باطل کے ساتھ دائمی ٹکراؤ اور ایک ابدی کشمکش کو اپنا مقدر بنا لیا تھا، شب و روز مزاحمت اور شب و روز پیش قدمی، شر کے ساتھ لحہ بہ لحہ تصادم اور ہر بار چوٹ کھا

کر زندہ تر ہو جانے کی ادا اور دشمن سے نپٹنے کی تازہ تر آرزو اور امنگ ؎

آتشِ زندہ میں ہو جاتے ہیں بجھ کر زندہ تر　　مر کے بھی اُٹھنے کا سرِّ ارتقاء رکھتے ہیں ہم

حضورؐ کے منہ مانگے گرامی قدر اور گراں قدر رفیق حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے استقامت کی وضاحت یہ فرمائی تھی کہ آدمی شیر کی طرح جم کر سیدھا چلے، لومڑی کی طرح دائیں بائیں نکلنے کے راستے نہ ڈھونڈے ۔ اسی انداز کی بے خوف استقامت اور اسی طرح عمر بھر کے لئے جادۂ حق پر مضبوط اور اٹل گام زنی اور پیش قدمی امیرِ شریعتؒ کا وہ پرکشش بے باکانہ کردار ہے جسے بے ساختہ گلے لگا لینے کو جی چاہتا ہے ؎

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اسی زندگی کا مفہوم یہی ہے کہ تعذیب کے تجربے سے گذر کر تہذیب حاصل کرے، تعذیب یعنی عذاب جھیلے بغیر وہ تزکیہ و تہذیب یعنی نکھرنے اور سنور جانے کی انتہائی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتی، حضورؐ مزکّی تھے، صحابہؓ کا تزکیہ نفس صرف اس وقت ممکن ہوا جب مصیبتوں اور دکھوں کی آگ نے ان کی زمانۂ جاہلیت کی ہر آلائش کو جلا کر راکھ کر دیا اور انہیں کندن بنا دیا۔

شاہ جی مرحوم بھی برطانوی حکمرانوں کے گوناگوں تشدّد کا مسلسل نشانہ بنے، پے در پے گرفتاریوں، پے در پے مقدموں، مسلسل قید و بند، مسلسل طوق و سلاسل کی اذیتوں کے مرحلوں سے گذرنے کے علاوہ قاتلانہ حملے ان پر ہوئے، زہر انہیں دیا گیا، قتل میں ملوّث کرنے کی پوری سازشیں کی گئیں۔ تقریر کے موقع اور مقام پر پہلے سے فائرنگ کر کے خوف و ہراس پھیلانے کی کوششیں عمل میں لائی گئیں، تقریر کے لئے جس راستے سے گذر کر جانا تھا وہاں فرنگی فرمانرواؤں اور ان کے گماشتوں کی طرف سے غنڈے گھات میں بٹھائے گئے تاکہ شاہ جی اور ان کے ساتھیوں کو خوف زدہ کیا جا سکے ۔ اذیتوں کے ان تمام تجربوں کو شاہ جی نے اپنے لئے تزکیۂ باطن اور تہذیبِ نفس کا ذریعہ بنایا، ۲۱-۱۹۲۰ء میں جب ایک پہلے مقدمہ میں مجسٹریٹ کی طرف سے حبسِ دوام کی سزا متوقع تھی اور سزا صرف تین سال قید بامشقت کی سنائی گئی تو شاہ جی نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

دار کے حق دار کو یہ قید سہ سالہ سلے
ہائے مشکل تھی جو آساں ہوتے ہوتے رہ گئی

آگے جیل میں منتقل کرنے کی روداد جانباز مرزا کے اپنے الفاظ میں سنئے:

"گاڑی چلنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ شاہ جی کو اسٹیشن پر لایا گیا

پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑی، اس حالت میں یہ مردِ درویش جب اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو پتھر بھی آبدیدہ ہو گئے، برطانوی سامراج کا مجرم، وطن کا سپاہی، قرآن کا مبلغ آزادیٔ وطن کے جرم میں آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا، قیدیوں کی ویگن میں بیٹھنے کے لئے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا ؎

عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا"

یہ عشق کیا تھا؟ شاہ جی کے ہاں یہ عشق، عشقِ رسالت تھا جس کی آتش سوزاں میں وہ عمر بھر جلے، دراصل یہی عشق تھا جس نے ان کی زندگی کو موجِ تند جولاں بنا دیا تھا، یہی سوزِ عشقِ رسالت تھا جس سے ان کی تقریریں لبریز ہوتی تھیں، اسی عشقِ رسالت کی آگ تھی جس کی وجہ سے وہ کبھی تحریکِ ختمِ نبوت، کبھی تحریکِ احرار، کبھی تحریکِ خلافت وغیرہ کی سرگرمیوں میں شریک ہو کر ہمیشہ فیصلہ کن کردار ادا کرتے رہے، ان کے ہاں عشقِ رسالت اگر نہ ہوتا تو وہ مرزائیت کے خلاف دفاعِ رسالت اور تحفظِ نبوۃ کا عظیم کام کیسے سرانجام دے سکتے تھے؟

شاہ جی مرحوم سنتِ ابراہیمی کی پیروی میں ساری عمر بتانِ آذری کو پاش پاش کرتے رہے۔ کیسے کیسے بُت تھے جو انہوں نے توڑے، فرنگی استعمار اور معاشی استحصال کے بُت، قادیانیت اور ملوکیت کے بُت، جاہلی رسوم و رواج کے بُت، شرک و بدعات کے بُت، ملمع ساز پیرانِ پارسا کی پارسائی کے بُت سیاست کے جعلی سکہ سازوں کے بُت، بُت شکنی کا یہ سارا عمل انہوں نے لا اللہ کی تیغِ براں سے سرانجام دیا۔ لا اللہ نے انہیں ہر طاغوتی طاقت سے انکار پر ابھارا، سارے بتوں سے یہ انکار دراصل ایک خدا کی ہستی کے اقرار کے لئے تھا۔ انہوں نے عمر بھر یہ نعرۂ توحید و تکبیر بلند کیا کہ:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آزری،

شاہ جی اپنی شخصیت کے لحاظ سے غیر معمولی انسان تھے، سُرمیں تھے، ان کی مردانہ وجاہت اور شوکت اور ان کی آواز کے انتہائی سُریلے زیر و بم نے نہ جانے کن کن لوگوں کے اندر چپکے چپکے ان کے لئے احساسِ پرستش ابھارا ہوگا، ان کی خطیبانہ سحر انگیزی ناقابل مزاحمت اثر کی حامل تھی، اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کی آواز نے معاشرے کے ہر طبقے کے افراد کو متأثر کیا، سماج کا نچلا طبقہ بھی ویسے ہی متأثر ہوا جیسے متوسط اور اعلیٰ طبقہ، تینوں کے تینوں طبقوں کے وہ تمام مرد و زن خواہ مسلمان تھے، ہندو تھے، سکھ تھے یا عیسائی، جو بھی بحیثیت سامع ان کی آواز کے غیر معمولی ارتعاش کی زد میں آیا وہ کوشش کے باوجود متأثر